خطبۂ اجتہاد پر ایک نظر

الطاف احمد اعظمی

جناب الطاف احمد اعظمی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن مجید میں جن معاملات زندگی سے متعلق تفصیلی احکام دئیے گئے ہیں، وہ ناقابل تغیر ہیں اور جہاں یہ تفصیل نہیں ہے، وہاں بالقصد تفصیل سے گریز کیا گیا ہے تاکہ ان امور میں حالات و مقتضیات زمانہ کے لحاظ سے تفصیلی احکام بنائے جائیں۔ اسی کا نام اجتہاد ہے، اس سلسلے میں نبی ﷺ کے اجتہادات کی حیثیت نظائر کی ہے۔

اسلامی قانون کے پہلے مآخذ (قرآن) کے بارے میں اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ کلی طور پر صحیح نہیں ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ قرآن مجید کتاب اصول ہے اور اس میں معاملات زندگی کے متعلق احکام کی تفصیلی صورتیں کم ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں، جیسا کہ اقبال نے سمجھا ہے کہ قرآن مجید کی اصلی غایت خدا اور کائنات کا ادراک و عرفان ہے، اس لئے مسائل حیات سے اس میں زیادہ تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن اور اس کے مختلف سماجی ادارات دونوں ارتقاء پذیر ہیں، اس لئے کوئی ایسا مجموعۂ قوانین نہیں بنایا جاسکتا تھا، جو ہر دور کے مختلف النوع تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اسی لئے زیادہ تر اصولی احکام دیئے گئے ہیں۔ مفصل قوانین کی تعداد نہایت قلیل ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں بعض اصولی احکام کی تفصیل کیوں کی گئی ہے؟ جس طرح نصوص قرآن کی مدد سے نبی ﷺ نے بہت سے تفصیلی احکام و قوانین بنائے، اسی طرح ان اصولی احکام کی تفصیلی صورت بھی آپؐ بنا سکتے تھے۔ دوسرے بہت سے علماء کی طرح اقبال بھی اس کی حقیقی وجہ سمجھنے سے قاصر رہے۔

قرآنی احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم ان احکام کی ہے، جن کا تعلق عقائد اور عبادات سے ہے اور دوسری قسم میں وہ احکام آتے ہیں، جن کا تعلق اجتماعی معاملات سے ہے۔ عقائد سے متعلق جو احکام قرآن مجید میں مذکور ہیں، وہ مفصل بھی ہیں اور ناقابل تغیر بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق ناقابل تغیر کائناتی حقائق سے ہے۔ لیکن عبادات کا معاملہ اس سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں کلی اور جزئی دونوں طرح کے احکام ملتے ہیں اور ان میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں مثلاً عبادات میں نماز کو لیں۔ قرآن مجید میں نماز کی تفصیلی صورت مذکور نہیں ہے لیکن وضوء کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ بات بظاہر بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ یہ کام تو نبی ﷺ بھی کر سکتے تھے اور احادیث میں وضوء کی تفصیل موجود بھی ہے۔ قرآن میں حکم وضوء کی تفصیل سے دراصل روح عبادت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ وہ ایک عمل تطہیر ہے، جس سے جسم اور نفس دونوں کی پاکی حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (سورہ عنکبوت:۴۵)

''بے شک نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے''

روح عبادت کو قرآن مجید کی اصطلاح میں تقویٰ کہا گیا ہے۔ روزے کے ذکر میں ہے: ''اے ایمان والو! تم پر اسی طرح روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر یہ فرض تھا تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو'' (سورہ بقرہ:۱۸۳) حج کے ذکر میں ہے: ''اللہ تک نہ تو ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون بلکہ اس تک جو چیز پہنچتی ہے وہ تمہارا تقویٰ ہے'' (سورہ حج:۳۷)

نماز کے بعد زکوٰۃ کو لیں۔ زکوٰۃ کا نصاب قرآن مجید میں غیر متعین ہے، لیکن مصارف زکوٰۃ متعین کر دیئے گئے ہیں۔ نصاب زکوٰۃ کے عدم تعین کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق انسان کی اقتصادی حالت سے ہے اور اقتصادی حالت ہر دور میں بدلتی رہتی ہے۔ اس کا کوئی ایسا نصاب متعین نہیں کیا جاسکتا تھا، جو ہر دور کے انسانوں کی معاشی حالت کے مطابق ہو۔ مصارف زکوٰۃ کے تعین کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حالات و ظروف زمانہ کی تبدیلی کا برائے نام ہی اثر ان پر پڑ سکتا ہے، پھر بھی تعین میں وسیع الاطلاق الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً مصارف زکوٰۃ کی مد ''فی سبیل اللہ'' ہے، جس میں بے حد وسعت اور گنجائش ہے۔ مصارف زکوٰۃ کے تعین کی دوسری وجہ سماج کے کمزور طبقات یعنی غرباء اور مساکین وغیرہ کے حقوق کا تحفظ ہے۔ اس معاملے کو اللہ نے وحی کا جزء اسی لئے بنایا تاکہ آئندہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو سکے۔

اب غیر تعبدی احکام و قوانین کی طرف آئیں۔ عائلی قوانین کی تفصیل ہم کو سورہ بقرہ اور دوسری سورتوں میں ملتی ہے۔ اس کی تفصیل کی وجہ بھی بالکل واضح ہے،

یہاں عورتوں کے حقوق کا تحفظ مقصود ہے، جو مردوں کے مقابلے میں بہر حال سماج کا ایک کمزور طبقہ ہے۔

قرآن مجید میں عائلی زندگی سے متعلق جو احکام مذکور ہیں، وہ ہر اعتبار سے تفصیلی نہیں ہیں اور یہ بھی خالی از علت نہیں۔ جن عائلی معاملات کا تعلق حالات کی تبدیلی سے تھا، ان کو غیر متعین حالت میں رکھا گیا ہے، مثلاً مہر اور متاع کا تعین۔ معلوم ہے کہ مہر کا تعلق شوہر کی مالی استطاعت سے ہے اور یہ استطاعت ہر مرد میں یکساں نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ہر دور کے لئے اس کی کوئی متعین صورت ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر آج کے معاشی حالات کے لحاظ سے مہر کی رقم دس ہزار یا اس سے کچھ

نبی ﷺ کے وہ اعمال جو عبادات اور اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں ناقابل تغیر ہیں۔ لیکن معاملات سے متعلق احکام کی حیثیت دائمی نہیں ہے۔

زیادہ مقرر کی جائے، تو چند ہی سال کے بعد یہ رقم نہایت قلیل معلوم ہوگی۔ یہی معاملہ متاع کا ہے۔ طلاق کے بعد عورت کی دل بستگی اور آئندہ کی زندگی میں اس کو پیش آنے والے معاشی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے مرد پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ اس کو مالی مدد دے۔ ظاہر ہے کہ ہر دور میں مالی امداد کی ایک ہی شکل اور ایک ہی مقدار کا تعین مشکل ہے۔ کسی دور میں علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ مطلقہ عورت کا متاع ایک جوڑا کپڑا ہے۔ ممکن ہے کہ اس دور کے اقتصادی حالات کے لحاظ سے متاع کی یہ شکل مناسب رہی ہو، لیکن موجودہ دور میں اس کو مناسب کون کہہ سکتا ہے۔ عائلی زندگی سے متعلق دوسرے احکام کی بھی یہی نوعیت ہے۔

اس گفتگو سے ہم اس نتیجے تک پہنچے کہ قرآن مجید میں جن معاملات زندگی سے متعلق تفصیلی احکام دیئے گئے ہیں، وہ ناقابل تغیر ہیں اور جہاں یہ تفصیل نہیں ہے، وہاں بالقصد تفصیل سے گریز کیا گیا ہے تاکہ ان امور میں حالات و مقتضیات زمانہ کے لحاظ سے تفصیلی احکام بنائے جائیں۔ اسی کا نام اجتہاد ہے، اس سلسلے میں نبی ﷺ کے اجتہادات کی حیثیت نظائر کی ہے۔ نصوص قرآن اور نبی ﷺ کے اجتہادات کو سامنے رکھ کر مماثلت علت کی بنیاد پر نئے مسائل کا حل نکال لینا آسان ہے۔

اسلامی قانون کے دوسرے ماٰخذ یعنی حدیث پر اقبال نے جو بحث کی ہے، وہ مفید ہے لیکن جامع نہیں ہے۔ یہاں حدیث کے سلسلے میں چند اصولی باتوں کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن وسنت دو علیحدہ چیزیں ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن مجید اصل اور سنت اس کی فرع ہے، دوسرے لفظوں میں سنت قرآن مجید کے اصول وکلیات کی شرح و تفسیر ہے۔

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس شرح و تفسیر کا تعلق معاملات سے متعلق احکام سے ہے۔ عقائد کے معاملے میں قرآن مجید کسی شرح و وضاحت کا محتاج نہیں ہے، وہ بالکل واضح اور مفصل ہیں۔ عقائد سے متعلق جب بھی کوئی اختلاف واقع ہوگا، تو صرف قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس کا فیصلہ واجب العمل ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ اِلَى اللّٰهِ (سورہ شوریٰ: ۱۰)

''اور جس بات میں بھی تمہارا اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِىْ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (سورہ نحل: ۶۴)

''اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ جن امور میں وہ اختلاف کرتے ہیں ان کی اصل حقیقت ان پر واضح کردو''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید صرف مسلمانوں کے ہی اختلافات میں حکم نہیں ہے، بلکہ عقائد سے متعلق دوسرے فرقوں کے مذہبی اختلافات کے تصفیہ کا بھی واحد ذریعہ یہی کتاب ہے۔ عقائد کی تشریح و توضیح میں احادیث کو صرف تائید کے طور پر لایا جا سکتا ہے۔ جہاں قرآن و حدیث کے بیان میں تعارض واقع ہوگا، وہاں اصل یعنی قرآن مجید کا حکم ہی قابل حجت ہوگا اور حدیث کے بارے میں سکوت اختیار کرنا ہوگا۔ اس وقت عقائد سے متعلق مسلمانوں کے سارے مذہبی اختلافات اصل و فرع کے اس تعلق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں علماء سوء کی غلط تاویل وتشریح کا بھی دخل ہے۔

یہ بات کہ سنت کی حیثیت قرآن کے مجمل احکام یا نصوص قرآن کی شرح و تفصیل کی ہے، کچھ ہماری ذہنی اختراع نہیں ہے۔ تمام صالح علماء وفقہاء نے یہی بات لکھی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں:

''سنت اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے قرآن حکیم ہی کی طرف رجوع ہونے والی ہے۔ وہ یعنی سنت قرآن حکیم کے مجمل کی تفصیل یا مشکل کا بیان یا مختصر کی تشریح ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (ہم نے تمہاری طرف ذکر نازل کیا ہے تاکہ جو ان کی طرف بھیجا گیا ہے اس کو ان لوگوں پر واضح کردو) پس سنت میں کوئی ایسی بات نہ ملے گی، جس کی اجمالی یا تفصیلی دلالت قرآن حکیم میں موجود نہ ہو...... قرآن میں ہے: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (تم عظیم خلق کے مالک ہو) حضرت عائشہؓ نے خلق کی وضاحت میں فرمایا کہ رسول کا خلق قرآن مجید ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے تمام اقوال و افعال اور اقرار سب قرآن مجید کی طرف رجوع ہونے والے ہیں کیونکہ خلق کا تعلق انہی امور سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورہ نحل: ۸۹) فرمایا ہے، اس سے بھی سنت کا فی الجملہ قرآن میں ہونا لازم آتا ہے...... اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس کو قبول کرنے میں توقف ضروری ہے۔''

سنت کے اس مفہوم کی روشنی میں دیکھیں کہ قرآن مجید میں حکم ہے کہ زکوٰۃ دو (وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ) لیکن کس مقدار میں اور کب دی جائے، اس کی تعیین نبی ﷺ کے

قول وفعل نے کی۔ اسی طرح قرآن میں ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ دو، لیکن مال مسروقہ کی کس نوع میں اور کس مقدار پر ہاتھ کاٹا جائے اور یہ ہاتھ کہاں تک کٹے اور کن حالات میں یہ حکم نافذ العمل ہے، تمام امور کی تفصیل وتعیین نبی ﷺ نے کی۔

یہاں ایک اہم سوال اٹھتا ہے کہ نبی ﷺ کی تشریحات نصوص یعنی اجتہادات کی حیثیت دائمی ہے یعنی ناقابل تغیر اور ہر دور کے حالات میں خواہ وہ عہدِ نبوی کے حالات سے یکسر مختلف ہوں، کسی ردوبدل کے بغیر واجب التعمیل ہیں؟ کم نظر علماء کا خیال ہے کہ اجتہادات نبوی دائمی ہیں اور ان میں کوئی ترمیم واضافہ جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قول حق یہ ہے کہ نبیؐ کے وہ اعمال جو عبادات اور اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں ناقابل تغیر ہیں۔ لیکن معاملات سے متعلق احکام کی حیثیت دائمی نہیں ہے، حالات اور ظروف زمانہ کے لحاظ سے ان میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا نبی ﷺ کے اجتہادات میں مقامی حالات اور عربوں کی عادات ونفسیات کا کوئی لحاظ رکھا گیا ہے؟ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے نہایت عمدہ بحث کی ہے اور اس کا کچھ حصہ اقبال نے بھی نقل کیا ہے جیسا کہ بیان ہوا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''اگر تم رسول اللہ کی شریعت کی گہرائیوں کو سمجھنا چاہو تو پہلے عرب امیوں کے حالات کی تحقیق کرو، جن میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ وہی لوگ دراصل آپ کی شریعت کا تشریعی مادہ ہیں۔ اس کے بعد آپ کی اصلاح کی کیفیت پر نظر ڈالو، جو ان مقاصد کے تحت تشریع، تیسیر اور احکامِ ملت کے باب میں آپ نے انجام دی''۔

''حجۃ اللہ البالغہ'' میں ہی وہ مزید لکھتے ہیں:

''ان احکام ومراسم میں جو باتیں صحیح اور سیاست ملیہ کے اصول وقواعد کے موافق ہوتیں، ان میں یہ حضرات انبیاء کوئی تبدیلی نہیں کرتے، بلکہ ان کی طرف دعوت دیتے اور ان کی اتباع پر قوم کو ابھارتے ہیں اور جو باتیں بری ہوتی ہیں یا ان میں تحریف داخل ہوچکی ہوتی ہے، ان میں وہ بقدرِ ضرورت ترمیم کرتے ہیں اور جن امور میں اضافہ کی ضرورت سمجھتے ہیں ان میں اضافہ کرتے ہیں''۔

ان اقتباسات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے بہت سے اجتہادات مقامی نوعیت کے تھے اور ایک خاص قوم (عربوں) کی عادات ورسوم کی رعایت پر مبنی تھے۔ اس کے علاوہ بعض اجتہادات میں وقتی مصالح کا لحاظ بھی شامل تھا۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو پھر یہ قول کہ نبی ﷺ کے تمام اجتہادات دائمی ہیں کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔

علماء جب ناسخ ومنسوخ کے مسئلے پر بحث کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت نے شریعت موسوی کو منسوخ کردیا ہے۔ جب سوال ہوتا ہے کہ آخر اللہ نے خود اپنی بنائی ہوئی شریعت کو منسوخ کیوں کیا؟ تو اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو جو احکام دیئے گئے تھے، وہ ان کے تمدنی حالات اور ان کی مخصوص عادات ونفسیات کے مطابق تھے۔ چونکہ عربوں کے تمدنی کوائف اور ان کی عادات ورسوم قوم یہود سے مختلف تھے، اس لئے قانون موسوی میں ترمیم واضافہ ناگزیر تھا۔ یہ بالکل صحیح جواب ہے اور حقائق پر مبنی ہے۔ پھر علماء کس طرح کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے جملہ اجتہادات میں ادنیٰ تغیر بھی ممکن نہیں ہے۔ کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ جو سماجی ومعاشی اور تہذیبی احوال عہدِ نبوی میں تھے، وہی احوال وکوائف آج بھی ہیں اور جو قومی عادات ورسوم اور نفسیات عربوں کے تھے، وہی ہندوستان یا دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے بھی ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہوگا، تو پھر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ معاملات سے متعلق نبی ﷺ کے کل اجتہادات دائمی نہیں ہوسکتے ہیں۔ ان میں ہر ملک کے حالات ومقتضیات کے لحاظ سے ضروری حد تک ترمیم واضافہ نہ صرف جائز ہے، بلکہ یہ عین سنت نبی کی پیروی ہوگی۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی درج ذیل آیت واضح رہنمائی کرتی ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ (سورۂ نحل:۴۴)

''اور ہم نے تمہاری طرف ذکر (قرآن حکیم) نازل کیا ہے تاکہ جو چیز لوگوں کی طرف نازل کی گئی ہے، تم اس کو ان کے سامنے کھول کر بیان کردو اور توقع ہے کہ وہ غور کریں گے''

علماء اسلام نے سنت کے اثبات میں اس آیت کو کثرت سے نقل کیا ہے لیکن اکثر نے ''وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ'' کے جملے کو نظر انداز کردیا ہے۔ انہوں نے یا تو اس جملے کا صحیح مطلب نہیں سمجھا اور یا اپنے نقطۂ نظر کے خلاف پا کر اس سے چشم پوشی کی ہے۔ مذکورہ آیت سے بالکل واضح ہے کہ کار رسالت میں یہ بات داخل تھی کہ آپ ﷺ اپنے عہد کے تمدنی حالات اور مخاطب قوم کی نفسیات وعادات کا لحاظ کرتے ہوئے آیات احکام کی قولی اور عملی تشریح کریں اور بعد کے لوگ ان تشریحات رسول (اجتہادات) کی روشنی میں اپنے عہد کے حالات اور تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے جہاں ضروری ہو، وہاں اجتہاد کریں۔ یہی مطلب ہے ''وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ'' کا۔

> ایک اہم سوال یہ ہے کہ نبی ﷺ کی تشریحات نصوص یعنی اجتہادات کی حیثیت دائمی ہے یعنی ناقابل تغیر اور ہر دور کے حالات میں خواہ وہ عہدِ نبوی کے حالات سے یکسر مختلف ہوں، کسی ردو بدل کے بغیر واجب التعمیل ہیں؟

صحابہ رضی اللہ عنہم نے ''وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ'' کا صحیح مطلب سمجھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نبی ﷺ کی وفات کے بعد متعدد نئے اجتہادات کئے۔ مثلاً عہدِ نبوی میں عورتوں کو اجازت تھی کہ وہ مسجدوں میں جا کر عبادت کریں، لیکن حضرت عمر فاروقؓ

نے اپنے عہد میں یہ اجازت منسوخ کردی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس حالت کو دیکھتے جو عورتوں نے اب پیدا کردی ہے، تو ان کو مسجدوں میں جانے سے روک دیتے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئی تھیں۔ اسی طرح نبی ﷺ کے عہد میں نصِ قرآن کے مطابق کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت تھی لیکن خلیفۂ ثانی نے اس اجازت کو معطل کردیا۔ معلوم ہے کہ نبی ﷺ کے دور میں ایک نشست میں تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق خیال کیا جاتا تھا، لیکن عہد فاروقی میں ان کو طلاق بائنہ قرار دے کر نافذ کردیا جاتا تھا۔ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں یہ معمول تھا کہ مفتوحہ زمین مجاہدین میں تقسیم کردی جاتی تھی، لیکن عہد فاروقی میں عراق فتح ہوا، تو عمرؓ نے مفتوحہ اراضی کو مجاہدین میں تقسیم کرنے سے انکار کردیا۔

یہ چند مثالیں میں نے یہ دکھانے کے لئے نقل کی ہیں کہ عہد صحابہ میں رسول ﷺ کے اجتہادات میں بقدرِ ضرورت تغیر کو جائز سمجھا جاتا تھا اور اس کی وجہ بدلے ہوئے حالات تھے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ خلیفۂ ثانی کے اجتہادات کو جماعت صحابہ کی تائید حاصل تھی۔ اگر احکام نبی میں تبدیلی خلاف ایمان ہوتی، تو صحابہ کرامؓ اس پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔

> عہد صحابہ میں رسول ﷺ کے اجتہادات میں بقدر ضرورت تغیر کو جائز سمجھا جاتا تھا اور اسکی وجہ بدلے ہوئے حالات تھے۔ خلیفۂ ثانی کے اجتہادات کو جماعت صحابہ کی تائید حاصل تھی۔

خلیفۂ ثانی کے ان اجتہادات کے پیش نظر علماء حق نے اسلامی قانون سازی میں اس بات کو ایک مسلمہ اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے کہ معاملات سے متعلق شریعت کے جزئی احکام حالات اور ظروف زمانہ کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں اور یہ ایک بالکل فطری بات ہے۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے:

"وذلک لان الأحکام شرعت، والأیات نزلت، لمصالح العباد وتکمیل نفوسهم فضلا من الله ورحمته، وذلک یختلف باختلاف الاعصار و الاشخاص کأسباب المعاش. فان النافع فی عصر واحد یضر فی غیره۔

"جوازِ نسخ یہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے بندوں کے مصالح اور ان کے نفوس کی تکمیل کیلئے احکام مقرر ہوئے اور آیتیں نازل ہوئیں۔ یہ مصالح اشخاص اور ازمنہ کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں، جیسے اسباب معاش وغیرہ۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ ایک زمانہ میں جو چیز نافع ہوتی ہے، دوسرے زمانہ میں وہی چیز مضر بن جاتی ہے"۔

اس سلسلے میں عہد حاضر کے معروف ہندی عالم مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کے خیالات بھی ملاحظہ ہوں:

"ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں، ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کردی ہیں، اس لئے ان میں تغیر و تبدل یا کسی تشکیل جدید کا سوال پیدا نہیں ہوتا البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی و اجتماعی امور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے ادلتے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کی ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے، جن میں اصول وقواعد کلیہ کے تحت توسعات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے"۔

چوتھی صدی ہجری تک مذکورہ تشریعی اصول کے مطابق اجتماعی امور سے متعلق احکام شریعت میں خواہ ان کا تعلق نبی ﷺ کے اجتہادات سے ہو اور خواہ صحابہ کے اجتہادات سے، حالات زمانہ کے لحاظ سے برابر تغیر و تبدل کا عمل جاری رہا اور قیاس کے اصول پر نئے احکام وضع کئے گئے۔ موجودہ مکاتب فقہ کا وجود اس تغیر کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔

لیکن چوتھی صدی ہجری کے بعد علماء کے رویے میں واضح تبدیلی ملتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف نبی ﷺ اور صحابہ کے اجتہادات کو دائمی حیثیت دی بلکہ فقہاء (ائمہ اربعہ) کے اجتہادات یعنی قیاسی احکام میں بھی کسی تبدیلی کو خارج از بحث قرار دیا۔

ایک زمانہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ نے معاملات سے متعلق مستند احادیث کی موجودگی میں قیاس سے کام لیا اور حدیث سے صرف نظر کر گئے۔ مثال کے طور پر نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق پانچ وسق سے کم غلے اور پھلوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے (بخاری) لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر قسم کی زمینی پیداوار میں خواہ پانچ وسق سے کم ہو زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر آج کوئی عالم دین یہ کہنے کی جرأت کرے کہ نبی ﷺ نے زکوٰۃ کا جو نصاب مقرر کیا تھا، اس میں معاشی حالات کے بدل جانے کی وجہ سے تبدیلی کی ضرورت ہے، تو سب سے پہلے فقہ حنفی کے پیرو ہی تکفیر کی تلوار لئے اس غریب عالم کے پیچھے دوڑ پڑیں گے۔

اصحاب علم جانتے ہیں کہ نبی ﷺ نے زکوٰۃ کا جو نصاب بنایا تھا، وہ اس عہد کے معاشی حالات کے مطابق تھا اور اسی کو پیش نظر رکھ کر آپ ﷺ نے حدِ غنا کا تعین کیا تھا۔ مثلاً یہ کہ اگر کسی مسلمان کے پاس ۲۰ مثقال سونا یا ۲۰۰ درہم چاندی ہو تو وہ غنی سمجھا جائے گا اور اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ چاندی کو بنیاد بنا کر غلے، پھلوں اور جانوروں وغیرہ کا نصاب مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے بالکل ظاہر ہے کہ تمام اجناس زکوٰۃ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے مساوات تھی۔ پانچ وسق غلہ یا پھل باعتبار قیمت ۲۰۰ درہم چاندی کے مساوی تھے لیکن بعد کے ادوار میں نہ صرف سونے اور چاندی کی قیمتوں میں فرق پیدا ہوا، بلکہ دوسری اجناس زکوٰۃ کی قدر و قیمت میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی اور بایں طور چاندی اور دیگر اجناس زکوٰۃ میں باعتبار قدر (Value) جو توازن عہدِ نبوی میں تھا وہ باقی نہیں رہا۔

مثال کے طور پر نبی ﷺ کے عہد میں پانچ وسق غلہ یا پھل رکھنے والے شخص کو

غنی سمجھا جاتا تھا اور اس پر زکوٰۃ عائد ہو جاتی تھی، لیکن آج کے دور میں پانچ وسق کو حد غنا قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس مقدار میں غلہ یا پھل رکھنے والا شخص غنی کے بجائے مفلس سمجھا جاتا ہے۔ حد غنا میں اس فرق کی وجہ غلے کی قیمت میں کمی اور دوسری اشیاء صرف کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہے۔

معاملہ صرف نصاب زکوٰۃ ہی کا نہیں ہے، دوسرے شرعی امور میں بھی اس دور کے علماء کا رویہ غیر دانشمندانہ ہے۔ آج کل ہندوستان میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ کیا موجودہ حالات میں عورتیں مسجدوں میں جا کر نماز باجماعت ادا کر سکتی ہیں؟ اس مسئلے میں علماء کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت ان لوگوں کی ہے، جو سلفی مسلک رکھتے ہیں اور اہل حدیث کے نام سے معروف ہیں اور دوسری جماعت میں وہ علماء ہیں جو دیوبندی مسلک رکھتے ہیں یعنی فقہ حنفی کے پیرو۔ علماء دیوبند کا خیال ہے کہ اس دور میں عورتوں کا مسجدوں میں جا کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ وقف دارالعلوم دیوبند کے نائب مفتی نے اپنے ایک فتویٰ میں یہی بات لکھی ہے۔ انہوں نے دلیل میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، جو موطأ امام مالکؒ میں منقول ہے کہ آج کے دور میں (مراد ان کے دور میں) عورتوں نے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے، اگر اس کو رسول اللہ ﷺ دیکھ لیتے تو عورتوں کو مساجد میں جانے سے بالکل اس طرح روک دیتے، جیسے بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا۔ حضرت عائشہؓ کے اس قول کو بنیاد بنا کر مفتی مذکور نے اپنے فتوے میں لکھا ہے کہ ''جب اس دور میں فتنہ اتنا زیادہ ہو گیا تھا اور عورتوں نے مساجد میں جا کر نماز پڑھنا بند کر دیا تھا، تو آج کے دور میں فتنہ کی زیادتی کی وجہ سے یہ صورت لامحالہ ممنوع ہے۔

اسی بناء پر فقہائے احناف کے نزدیک عورتوں کا مساجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ شامی اور بحرالرائق میں مذکور ہے۔'' دارالعلوم دیوبند کے مفتی کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ اس دیوبندی فتوے کے جواب میں اول الذکر جماعت علماء (اہل حدیث) کی طرف سے اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ فتویٰ مذکور خلاف سنت ہے۔ نبی ﷺ نے عورتوں کو مساجد میں جا کر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے اور عہد نبوی میں عورتیں مسجدوں میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھتی تھیں، اس لئے کسی عالم دین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ سنت کی منسوخی کا حکم دے۔ اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک صاحب لکھتے ہیں:

''آپ کے مؤقر اخبار قومی آواز ۱۲/۹/۱۹۹۷ء کی اشاعت میں دارالعلوم دیوبند کے مفتیوں کا فتویٰ شائع ہوا ہے، جس میں عورتوں کو مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مفتیان دیوبند کا یہ فتویٰ غیر شرعی اور کتاب و سنت کے قطعاً خلاف ہے۔ اس فتویٰ میں تضاد بیانیوں کے علاوہ نہایت سطحیت ہے، جو ملک کے اتنے بڑے ادارہ کے شایان شان نہیں ہے...... یہ ان مفتیوں کی شریعت اسلامیہ میں کھلی مداخلت اور نبی کریم ﷺ کی احادیث سے بغاوت کی کھلی دلیل ہے۔ کتنی جرأت ہے ان لوگوں میں کہ شریعت کی جائز اور مباح بات کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ کل قیامت میں اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ کیا ان حدیثوں کو جھٹلایا جا سکتا ہے، جن میں نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرنے کی اجازت دی ہے اور نماز عیدین میں عورتوں کو شرکت کی تاکید فرمائی ہے۔

بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور موطأ امام مالک وغیرہ کتب احادیث میں بہت سی حدیثیں موجود ہیں، جن میں فرمایا گیا ہے ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد میں جانے سے مت روکو'' (بخاری) ''جب تم سے تمہاری بیویاں مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کی اجازت مانگیں تو انہیں منع مت کرو'' (مسلم) ''اللہ کی بندیوں کو مسجد میں آنے سے منع مت کرو اگرچہ ان کے گھر ان کے لئے بہتر ہیں'' (ابوداؤد، مسند احمد)

اسی طرح نماز عیدین میں خواتین کے شریک ہونے کا حکم فرمایا گیا بلکہ حائضہ عورتوں کو بھی عیدگاہ میں جانے کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ نماز نہ پڑھیں مگر دعاء میں شریک ہوں (بخاری و مسلم) ان کے علاوہ بھی اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں، جن کی موجودگی میں دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کا فتویٰ قطعی غیر معتبر، غلط اور نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ ان حضرات نے عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو فساد و فتنہ، عصمت دری اور تاک جھانک جیسے واقعات سرزد ہونے کا سبب بتایا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کیا مسلمان عورت کسی جائز کام سے شرعی حدود میں رہتے ہوئے گھر سے باہر نہیں نکل سکتی؟ سفر حج پر جانے کے لئے خواتین کتنا لمبا سفر کرتی ہیں، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، منیٰ عرفات اور دیگر مقامات مقدسہ کا سفر کرتی ہیں، حرم بیت اللہ اور مسجد نبویؐ میں نماز باجماعت ادا کرتی ہیں۔ ان تمام امور پر بھی پابندی لگانے کی جرأت فرمائی جائے گی۔ حرم شریف میں بیت اللہ کا چوبیس گھنٹہ طواف ہوتا ہے۔ مرد و عورت، بوڑھے اور جوان سب ہی طواف کرتے ہیں۔ کیا یہ مفتیان دارالعلوم دیوبند اس پر بھی پابندی لگائیں گے۔ ان حضرات کو قرآن مجید کی اس آیت پر غور کرنا چاہیے اور مذہبی تعصب سے اجتناب کرنا چاہیے۔ پارہ نمبر (۱) سورہ بقرہ آیت نمبر (۱۱۴) جس کا ترجمہ یہ ہے ''اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا ذکر کئے جانے کو روکے؟۔''

غور کریں تو صاف ظاہر ہو گا کہ دونوں جماعتوں کے علماء میں تدبر کی کمی ہے۔ سلفی علماء (اہل حدیث) نبی ﷺ کی کسی سنت میں تبدیلی کو جائز نہیں رکھتے، خواہ حالات اس کے متقاضی ہوں۔ یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے، اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ سے جو روایت کتب حدیث میں مروی ہے اور جس کا ذکر اوپر ہوا، اس سے صاف

ظاہر ہے کہ موجودہ حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ عورتیں مسجدوں میں جا کر نماز باجماعت ادا کریں۔ جب عہد فاروقی میں عورتوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی، تو اس دورفتن میں اس امر کی اجازت کس طرح دی جاسکتی ہے؟ یہ عبادت کے ساتھ کھلواڑ کے مترادف ہوگا۔ ایک طرف نبی ﷺ نے عورتوں کو مسجدوں میں جا کر نماز پڑھنے کی اجازت دی، تو دوسری طرف یہ بھی فرمادیا کہ گھروں میں نماز پڑھنا ان کے لئے افضل ہے (مشکوٰۃ) یہ بات آئندہ کے حالات کی رعایت سے ارشاد فرمائی گئی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرے سے مسجدوں میں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس کو مکروہ تحریمی کہنا مداخلت فی الدین ہے۔ نبی ﷺ کی اجازت غیر موافق حالات کی وجہ سے صرف معطل ہے، منسوخ نہیں ہوئی ہے اور یہ تعطل بھی کلی نہیں ہے۔ جہاں حالات اجازت دیں اور علیٰحدہ مناسب انتظام ہو، وہاں جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں عورتوں کی شرکت بالکل جائز ہے۔ آپ یہ نہ بھولیں کہ نماز جمعہ میں جو خطبہ دیا جاتا ہے، اس کی غرض مسلمانوں کی دینی تعلیم ہے۔ آخر عورتیں اس تعلیم سے کیوں محروم رکھی جائیں؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ عیدین کے اجتماعات میں عورتوں کو بھی شرکت کی تاکید فرماتے تھے حتیٰ کہ حائضہ عورتوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ ان اجتماعات میں شریک ہوں البتہ نماز نہ پڑھیں۔ اس کی غرض یہی تھی کہ وہ تعلیم سے مستفید ہوں اور ان کے اندر بھی ملی شعور اور نظم وضبط کا جوہر پیدا ہو۔

راقم کے خیال میں علماء دیوبند کا نقطۂ نظر اصولاً صحیح ہے، لیکن اس میں بے جا شدت ہے۔ انہوں نے جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں بھی عورتوں کی شرکت کو خواہ ان کے لئے علیٰحدہ انتظام ہو اور حالات بھی پرامن ہوں، ناجائز ٹھہرالیا ہے۔ اس سے قطع نظر علماء دیوبند کے مسلک سے اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کی ایک سنت کو حالات کی وجہ سے ترک کیا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حالات و ظروف کی تبدیلی سے نبی کی کسی سنت کا ترک یا تعطل ممکن ہے لیکن ان علماء میں یہ دینی جرأت نہیں کہ وہ کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف کریں، وہ عوام سے خائف ہیں کہ مبادا انہیں تارک سنت قرار دیا جائے۔ ایک دیوبندی مسلک کے حامل شخص کا اعتراف حقیقت ملاحظہ ہو:

> ''واضح رہے کہ حضرات فقہاء حنفیہؒ اس کا انکار نہیں کرتے کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں عورتیں نماز پنجگانہ اور عیدین کی جماعت میں حاضر ہوتی تھیں۔ وہ اس کا نہایت بلند آواز سے اقرار کرتے ہیں۔ پس حنفیہ کے سامنے ان روایتوں کا ذکر کرنا جن سے نبی کریمؐ کے زمانہ میں عورتوں کا جماعت میں جانا ثابت ہوتا ہو بے فائدہ ہوگا۔ کلام اس میں ہے کہ آیا اب بھی یہ حکم باقی ہے یا نہیں......؟

اس مراسلے کے آخری جملے سے صاف ظاہر ہے کہ علماء دیوبند اس شرعی اصول کو مانتے ہیں کہ حالات کی تبدیلی سے نبی ﷺ کے کسی حکم میں تبدیلی ہو سکتی ہے خواہ وہ تبدیلی عارضی ہی ہو۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ اس تبدیلی کا مجاز کوئی فرد نہیں بلکہ جماعت ہے، جس میں امیر المسلمین اور صاحب بصیرت علماء دونوں شامل ہیں۔

اسلامی قانون کا تیسرا ماٗخذ اجماع ہے یعنی اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ کرنا۔ یہ دراصل اجتماعی اجتہاد ہے، جو قرآن وسنت کے نصوص کی روشنی میں انجام پاتا ہے۔ اس کے متعلق اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ فکر انگیز ہیں۔ سنت کی طرح اجماع بھی زمانی ہے یعنی آئندہ حالات کے لحاظ سے اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی ایک دوسرے اجماع ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ کوئی انفرادی اجتہاد کسی اجماع کو منسوخ نہیں کرسکتا ہے۔ اقبال نے ان امور سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔

اس دور میں اجماع کی مختلف صورتیں ممکن ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ امیر المسلمین کی نگرانی میں علماء کی ایک مجلس یہ کام کرے، جس میں اسلامی شریعت کے ماہرین کے ساتھ جدید فلسفۂ قانون کے علماء بھی شامل ہوں۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ مسلم عوام کے ذریعے منتخب مجلس یہ فریضہ انجام دے۔ لیکن یہ اطمینان بخش صورت نہیں ہے، کیونکہ عوامی نمائندوں کی اکثریت اسلامی قانون اور اس کے اصول استخراج سے ناواقف ہوتی ہے۔ مناسب تر صورت یہ ہے کہ اسلامی قانون کے ماہر علماء کی مجلس اس کام کو انجام دے اور عوامی نمائندوں کی مجلس ضروری بحث ومباحثہ کے بعد اس کی منظوری دے۔ اگر مباحثہ کے دوران میں کوئی مفید قانونی نکتہ ابھر کر سامنے آئے، تو اس کو مجلس قانون کے پاس مزید غور وفکر کے لئے بھیجا جاسکتا ہے۔ اقبال نے مؤخر الذکر صورت کو ترجیح دی ہے۔

اسلامی قانون کا چوتھا ماٗخذ قیاس ہے، جو مماثلت علت کے اصول پر مبنی ہے۔ یہ اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے اور کثیر الوقوع ہے۔ معلوم ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد اصول قیاس پر ہے۔ دوسرے مکاتب قانون کے علماء حدیث کی موجودگی میں قیاس کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ہر حال میں سنت کی پیروی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال نے فقہاء حجاز اور فقہاء عراق کے طرز فکر پر جو تنقید کی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ عام حالات میں نصوص قرآن وسنت کی پیروی لازمی ہے۔

> حالات و ظروف کی تبدیلی سے نبیؐ کی کسی سنت کا ترک یا تعطل ممکن ہے لیکن علماء میں یہ دینی جرأت نہیں کہ وہ کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف کریں۔

پچھلے اجتہادات میں خواہ ان کا تعلق نبیؐ کے اجتہاد سے ہو، خواہ صحابہ اور تابعین کے اجتہاد سے، حذف و اضافہ صرف اسی صورت میں جائز ہے، جب حالات زمانہ شدت کے ساتھ اس کے متقاضی ہوں۔ البتہ نئے مسائل میں، جن کے بارے میں اسلامی شریعت خاموش ہو، اصول قیاس پر عمل کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ان مسائل میں اجتہاد نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔

فقہاء نے اصول قیاس سے جو تجاوز کیا (یعنی استدلال) وہ راقم کے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ استحسان کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ وہ

تحریف فی الدین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استصلاح جیسے اصول کا استعمال کر کے کسی بھی حرام کو بطائف الحیل حلال بنایا جا سکتا ہے۔ شرعی احکام کو ہر حال میں منصوصات پر مبنی ہونا چاہیے۔ نصوصِ قرآن وسنت سے باہر کوئی قانون سازی جائز نہیں ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قیاسی احکام حالات اور ظروفِ زمانہ کے تابع ہیں اور ان کی تبدیلی سے وہ بھی تبدیل ہو جائیں گے یا یوں کہہ لیں کہ ان کی اطلاقی صورتیں بدل جائیں گی۔ اس سلسلے میں حنفی فقہاء کا رویہ ماضی کی طرح آج بھی قابل اعتراض ہے۔ انہوں نے حنفی فقہ کو جو زیادہ تر قیاسی اور استدلالی احکام پر مشتمل ہے، ناقابل تغیر سمجھ لیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ دین کے مہمات امور میں انفرادی قیاس جائز نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ اسلامی قانون کے ماہر علماء کی ایک بڑی جماعت یہ کام انجام دے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ قیاس کوئی مستقل مأخذ قانون نہیں ہے۔ وہ دراصل اجتماعی اجتہاد (اجماع) کی قانونی اساس ہے، جس پر نئے احکام متفرع ہوتے ہیں۔

اقبال نے اسلامی قانون کے فروعی مأخذ، مثلاً استحسان، استصلاح یا مصالح مرسلہ اور عرف ورواج وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ان فروعی مأخذ کے قائل نہ رہے ہوں۔ اسلامی قانون کے مأخذ کی نسبت اس تفصیلی گفتگو سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ مستقل بالذات مأخذ قانون کی حیثیت صرف قرآن مجید کو حاصل ہے اور وہ دائمی یعنی ناقابل تغیر ہے۔ دیگر مأخذ قانون کی یہ حیثیت نہیں ہے، وہ احوال وظروفِ زمانہ کے تابع ہیں یعنی قابل تغیر جیسا کہ بیان ہوا۔

جب صورت واقعہ یہ ہے، تو پھر علماء کا یہ کہنا کہ عہد حاضر میں اجتہاد مطلق ممکن نہیں ہے کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ اجتہاد ہر دور میں فرض کفایہ ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کی بحث پوری طرح مدلل ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس دور میں ایسے علماء اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں، جو ائمہ اربعہ کی سی نظر اور علم رکھتے ہوں۔ اس کی تلافی اس طرح ممکن ہے کہ کسی ایک عالم کے بجائے، اسلامی قانون کے فاضل علماء کی ایک جماعت یہ کام کرے، بالکل اسی طرح جیسے امام ابوحنیفہؒ نے اپنے عہد میں یہ کام کیا تھا۔ یوں بھی اجتہاد مطلق کے لئے ضروری ہے کہ وہ انفرادی کے بجائے اجتماعی ہو کیونکہ اس میں خطاء کا امکان بہت بعید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء سلف نے اجتہاد مطلق کے لئے کڑی شرطیں محض اس لئے رکھی ہیں تا کہ موجودہ فقہی دبستانوں کا تسلط باقی رہے اور ائمہ اربعہ کے اجتہادات سے ہٹ کر کسی نئے اجتہاد کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ یہ بھی اسلاف پرستی کی ایک شکل ہے، جس میں اس وقت مسلمانوں کا سواد اعظم مبتلا ہے۔ اسی کورانہ تقلید نے ان کے قوائے فکریہ کو مفلوج بنایا اور اسلامی قانون کی ترقی رک گئی۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے اسلامی قانون کے مآخذ کے بارے میں اقبال کے خیالات کا جو تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے بالکل واضح ہو گیا کہ وہ ان مآخذ کے بارے میں ایک واضح تصور رکھتے تھے، لیکن اسلامی قانون کے اولین مأخذ یعنی قرآن مجید کے متعلق ان کے خیالات بہت واضح نہیں تھے۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے بعض احکام مقامی نوعیت کے ہیں اور ان کا اطلاق بعد کے زمانوں میں نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں انہوں نے جرائم کی ان سزاؤں کا ذکر کیا ہے، جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ سزائیں عربوں کے مزاج اور ان کے مخصوص تمدنی حالات کے تحت مقرر کی گئی تھیں، اس لئے مستقبل کی مسلم اقوام پر ان کو جوں کا توں نافذ کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

Shari'at values (Ahkam) resulting from this application (e.g; rules relating to penalties for crimes) are in a sense specific to that people; and, since their observance is not an end in itself, they cannot be strictly enforced in the case of future generations.

اقبال کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جیسا کہ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں، جن معاملات زندگی کے متعلق کوئی قانون واضح لفظوں میں دے دیا گیا ہے، اس کی حیثیت مقامی نہیں ہے۔ اس کا اطلاق مستقبل کی جملہ اقوام عالم پر بھی ہوگا، البتہ اس کے نفاذ میں اصول تدریج کا لحاظ رکھا جائے گا یعنی ہلکی سزاؤں کے بعد سخت سزائیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں زنا کی ایک سزا قید و بند ہے۔ اس سے زیادہ سخت سزا سو کوڑوں کی ہے (سورہ نور: ۲) اور اس فعل شنیع کے مکرر ارتکاب کی صورت میں سخت ترین سزا رجم یعنی سنگ ساری ہے اور یہ اجتہاد رسول ہے۔

اس نوع کی بعض فکری لغزشوں کے باوجود میں کہوں گا کہ اقبال قابلِ تعریف ہیں کہ انہوں نے اس عہد میں اجتہاد کی طرف مسلمانوں کے ارباب علم وفکر کو متوجہ کیا، جب قوم کے اکثر علماء وفقہاء نے اس اہم ضرورت کی طرف سے مکمل طور پر چشم پوشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اس لحاظ سے بھی قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے اس معاملے میں جرأت فکر کا مظاہرہ کیا اور کسی خوفِ طعن وتشنیع کے بغیر اپنے خیالات پیش کئے۔ اس جرأت اظہار کی وجہ سے ان سے بعض فکری خطائیں سرزد ہوئیں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے فکری جمود کو توڑنے میں بہت مدد ملی۔ سر سید علیہ الرحمہ نے مسلمانوں کی تقلیدی روش کے خلاف جو اعلانِ جہاد کیا تھا، اقبال کی کوشش اسی کی صدائے بازگشت ہے۔

(زیر نظر مضمون مصنف کی ایک کتاب ''خطبات اقبال - ایک مطالعہ'' (دار التذکیر، لاہور ۲۰۰۵ء) کے ایک باب کی تلخیص ہے، جس میں انہوں نے اسلامی قانون کے مآخذ کے بارے میں اقبال کے خیالات پر تبصرہ کیا ہے۔

○ پروفیسر الطاف احمد اعظمی، بھارت کی معروف جامعہ ہمدرد، دہلی میں کلیہ علوم اسلامیہ اور سماجی علوم کے ڈین ہیں۔